

سید محمد ذوالکفل بخاری

جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک

یادش بخیر، الطاف گوہر صاحب آج کل "نوائے وقت" میں "جنوں کی حکایت" لکھ رہے ہیں۔ اردو دان اور اردو خواں عوام کے لئے، ان ایسے خواص کا اتنا تردد، عین الطاف اور عین نوازش ہی تو ہے۔

"ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے"

لطف سخن تو ہے ہی خدا داد چیز، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مطلقوں، مقطعوں یا ان کے بچپوں بیچ، سخن گسترانہ باتوں کی "تغصیب" کا جیسا ہنر انہیں آتا ہے، اس میں بھی وہ یکتائیں۔ بلکہ یکہ تازیئیں۔ اپنے یکم دسمبر (۱۹۴۳ء) کے کالم "باتیں نواب کالا باغ مرحوم کی"----- میں الطاف صاحب نے حسب معمول بڑے مزے کی اور بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔----- فیض احمد فیض لے سما "دیکھو نا! جبر کی بھی ایک سائنس ہے۔ جسے ہر وہ شخص جو اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لے نہیں سمجھ سکتا۔ بعض مستند جاہل ہوتے ہیں اور بعض، نوآموز، اب نواب کالا باغ تھا، نجیب الطرفین جاہل، کیا مجال کسی چھوٹے آدمی پر ہاتھ ڈالے مگر سارے مغربی پاکستان میں اس کی دہشت تھی۔ بھٹو صاحب اس کی نقل کرتے تھے مگر جبر کی سائنس سے نا آشنا تھے۔"

یوں، الطاف صاحب نے اپنے کالم میں جبر کی سائنس کو حوالہ بنا کر نواب کالا باغ مرحوم کی شخصیت اور کردار کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن یہی بات تو یہ ہے کہ اول تو ہماری سمجھ میں یہ جبر کی سائنس آنی ہی نہیں۔ دیکھیے، ایک ہوتی ہے جبریت، جسے آپ ایسے پڑھے لکھے Fatalism یا Determinism کہیں گے۔ اور ایک ہوتی ہے جباریت، جسے شاید آپ Omnipotence کہیں گے۔ اب اگر ان کی کوئی سائنس، دریافت کر لی جائے تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ لیکن یہ جو جبر کی سائنس ہے، یہ تو مستلزم ہوگی ظلم و استبداد اور جور و جفا کی سائنس کو۔ اور جور کی سائنس آپ کو پتا ہے، عبارت ہے۔----- "افضل الجہاد، کلمۃ الحق عند السلطان الجائر" سے! جائز حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے سے (جی ہاں! سلطان جاہل نہیں، سلطان جائز!) جبکہ جفا کی سائنس۔-----؟ یہ تو بہت پرانی ہے۔

جہاں کم کن کہ فردا روز
پیش عاشقان شرمندہ باشی

کسانیں یہ چاہتا ہوں کہ ظلم، ظلم ہوتا ہے، استبداد، استبداد ہوتا ہے۔ اور جبر، جبر ہی ہوتا ہے۔ باقی رہی جبر کی سائنس، تو۔۔۔۔۔ دل کے پہلانے کو غالب یہ خیاں اچھا ہے۔ ہاں البتہ یہ اپنی اپنی قسمت اور ہمت یہ موقف

ہے کہ کون نواب کالا باغ اور بھٹو کے دور میں مقتل کو سرخرو کرتا ہے اور کون منسوب و جاہ کو!
ایک اور بات جس پر ہم چونکے اور ٹھٹھکے، ----- ہے وہ بھی سخن گسترانہ! الطاف، صاحب روای ہیں کہ
نواب کالا باغ نے ان سے کہا۔

”ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے، ان کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ صلح بھر کے
لوگ رات رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سرو دھتے، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے
ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں، نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور چڑھا
دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے
جاں فردوں کو اطلاع دی ”کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سرپرکھن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا، کیا
آپ میرے ہمراہ چلیں گے؟“ حاضرین جلسہ نے بیک زبان کہا ”ہاں چلیں گے“ اس اعلان کی گونج نواب
کالا باغ کے کان بھی پڑی۔ انہوں نے اپنے ایک معتد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام
بجھوایا کہ حضور شاہ صاحب بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائے، جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے ہم
آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے“ نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے یہ پیغام
کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا، تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مد مقابل کو پہچانا اور جب اس کے
گردن پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر جے رہیں، اور وار کو تو ایسا کہ رقیب روسیہ
جائزہ نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔“

اب میں کیا عرض کروں، کہ یہاں تو جبر کی سائنس، استائے لاغری سے دکھائی بھی نہیں دے رہی۔
و دعویٰ، دلیل، روایت اور درایت کی رو سے بلکہ درعایت سے بھی، اس حکایت کو پایہ ثنابت تک پہنچانا محال
ہے۔ پایہ ثنابت کہاں، اسے پایہ ثبوت تک بھی نہیں پہنچایا جاسکتا۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری،
ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ میانوالی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ کفن والی بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ بالکل بھی
نہیں۔ ہاں، شاہ صاحب کے ایک ساتھی تھے مولانا محمد گل شیر! احراری خطیبوں کی سنگت میں بہت نمایاں
تھے۔ یہ ”مرد در“ تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں نواب کالا باغ کے مظالم کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا اور
۱۹۴۴ء کے وسط میں، نواب صاحب کے حسب الارشاد، کفن اوڑھ کر، آسودہ خاک ہو گیا۔ اس اجمال کی کچھ
تفصیل عرض کر دینا یوں بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل تو نواب کالا باغ سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے
چونکہ اسے مولانا گل شیر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و سونے سے کچھ علاقہ ہو۔

یہ مولانا گل شیر صلح ایک کے ایک گاؤں (لمووالی) کے رہنے والے تھے۔ شمالی پنجاب میں ایک، کیسبل
پور، میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جہلم وغیرہ کے علاقوں میں یہی ایک آواز تھی جو گجیر داروں، وڈیروں،
نوٹوں، کاسہ لیسوں اور فرنگیوں کے لئے، ۱۹۲۸ء سے سوہان روح بن گئی تھی۔ خوف، مولانا کی چڑھی میں نہیں
تھا۔ مستزاد یہ کہ غضب کے خوش بیان، خوش الحان اور خوش شکل بھی! یہ واقعہ ہے کہ خلقت ان کی دیوانی
تھی۔ پروفیسر مرزا محمد مہر کے الفاظ ہیں کہ

”میں مولانا گل شیر کو عطاء اللہ شاہ بخاری سے برتر مقرر جانتا ہوں۔ ان کے بیان میں جو سوز اور درد

خود، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے الفاظ تھے کہ ”مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا، جس کی تلاوت اتنی موثر اور کیف آور ہو۔۔۔۔۔۔ خود ہی خیال فرمائیے کہ ایسے شخص کی ”خطرناکی“ میں نواب کالا باغ کو کیونکر شک ہو سکتا تھا۔ یہی مولانا گل شیر، ۱۹۳۹ء میں جب مجلس احرار اسلام میں شامل ہوئے تو ٹوٹے، ٹوٹے، خونین، ملک، ساوات اور پیر صاحبان اب ٹھیک ٹھیک انہی زدیں آنے لگے یا دوسرے لفظوں میں مولانا کی Range بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ قصہ مختصر، یہ کہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مجلس احرار نے مولانا کی سرکردگی میں کالا باغ میں تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ سردار خضر حیات، وزیر اعظم پنجاب، کچھ سپر انداز بھی ہوئے۔ وہ ایک چل کر آئے۔ لیکن نواب کالا باغ کے جبر و استبداد نے سپر انداز ہوتا نہیں سیکھا تھا۔ لہذا ۲۳ مئی ۱۹۴۴ء کو، مولانا محمد گل شیر کو، ان کے اپنے گھر میں، سوئے میں گولی مار دی گئی۔۔۔۔۔۔ اب آپ اسے جبر کی مانئیں کہہ لیں۔ Tyranny (استبداد) کہہ لیں، Despotism (مطلق العنانی) کہہ لیں، Autocracy (خود سری) کہہ لیں، یا Oppression (تعدی) کہہ لیں۔۔۔۔۔۔ الفاظ بدلنے سے حقیقت کبھی نہیں بدلی۔ کہیں نہیں بدلی۔

ان سطور کا راقم، اعتراف کرتا ہے کہ وہ الطاف گوہر صاحب کے علم، تجربے، مشاہدے اور تجزیے کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اسے یہ سودا بھی نہیں اور لپکا بھی نہیں! کہ وہ ایک فہمیدہ و جہانگیرہ (Veteran) شخص ہیں۔ ہفت زبان (Polyglot) ہیں۔ خوبیوں کا ایک جہان ہیں۔ لیکن ان سے اتنی بات کہنے کی اجازت ضرور، مجھے ملنی چاہیے کہ اگر جبر کی سائنس Exist کرتی ہے تو یقین جانے کہ پھر صبر کی سائنس بھی یہاں Exist کرتی ہے۔ اگر نواب کالا باغ کی زندگی جبر کی سائنس سے عبارت ہے تو ان کی موت، صبر کی سائنس ہے! الطاف صاحب خود لکھتے ہیں۔

”مجھے اتوار کی وہ صبح کہی نہیں بھولتی جب صدر صاحب نے مجھے طلب کیا اور بتایا کہ نواب کا لا باغ کو ان کی خواب گاہ میں قتل کر دیا گیا ہے، شہر یہ تھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے کسی اختلاف کی بنا پر باپ کے سر میں پستول کی گولی بیوست کر دی، نواب صاحب نے ایوب خان سے اپنی آخری ملاقات میں ایک ہی گزارش کی تھی اور وہ یہ کہ اگر ان کا چھوٹا بیٹا کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو اس کی مدد کی جائے۔“

الطاف صاحب! کہنے والے تو کہتے ہیں کہ صبر کی سائنس کا جادو، نواب کالا باغ کے صاحبزادے کے سر پر بھی چڑھ کر بولا۔ وہی ایک گمبولی، وہی غیر طبعی موت، وہی اجیرن زندگی۔۔۔ ان کے گھر میں، یہ تسلسلِ قوت آج بھی قائم ہے۔ اور امیر عبداللہ روکزی کے محتاط پرائے میں لکھے گئے الفاظ، اب بھی میرے سامنے ہیں کہ ۔۔۔۔۔ "عام طور پر ایسا مشہور ہے کہ دو سو کے لگ بجگ قتل، نواب آف کالا باغ کے ذمے تھے۔"

سابق آئی جی پنجاب، راجہ عبدالرشید کی کوای بھی توریکارڈر ہے کہ ۔۔۔۔۔ "یہ ان کی سرشت میں حاصل تھا کہ شریف آدمی، خاص طور سے خوددار آدمی کی پیٹری اچھا لی جائے!"

وہ ایک صاحب، اور ہوا کرتے تھے۔۔۔۔۔ جناب سکندر مرزا۔۔۔۔۔ "ان کو بھی اپنے خدا ہونے کا

انتاہی یقین تھا "اپنے نواب صاحب، نواب ہی تو تھے، یا پھر مغربی پاکستان کے گورنر ہو گئے۔ جبکہ سکندر مرزا صاحب تو گورنر جنرل اور صدر مملکت بھی ہوئے۔ ان کی تب و تاب جابرانہ کا کیا سنا۔ جدوہری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندرپور، ملک فیروز خان،۔۔۔۔۔ یہ سب وزراء اعظم انہوں نے یکے بعد دیگرے یوں بھگتائے اور چلتے کئے کہ۔۔۔۔۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ان کے مزاج کی رنگینی اور دماغ کی سنگینی کی داستانیں، الطاف گوہر صاحب کے علم میں بھی یقیناً ہوں گی۔ بہر حال میں یہاں شورش کاشمیری کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شیخ حسام الدین، حسین شہید سہروردی کے ساتھ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایک دن سہروردی صاحب نے ان سے کہا۔۔۔۔۔ شیخ صاحب! سکندر مرزا (صدر مملکت) کو مجلس احرار کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ذہن صاف ہو جائے لیکن آپ کی اس سے ملاقات مفید ہوگی۔ غرض شیخ صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری، سکندر مرزا سے ملاقات کیلئے گورنمنٹ ہاؤس لاہور، میں گئے۔ سکندر مرزا، اپنے صدارتی جاہ و جلال کے ساتھ برآمد ہوا اور خانا بے نیازی کے ساتھ فروکش ہو گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب، صوبہ کے وزیر اعلیٰ، ہمرا تھے۔ سہروردی نے مرزا سے کہا "دونوں احرار رہنا، شیخ صاحب اور ماسٹر جی، آئے ہیں۔" مرزا نے حثارت سے جواب دیا "احرار؟ پاکستان کے غدار ہیں۔"

ماسٹر جی، شہنزی طبیعت کے مالک، کہنے لگے۔ غدار میں تو پھانسی پر کھنچوا دیجئے، لیکن الزام کا ثبوت ہونا چاہیئے۔ سکندر مرزا نے اسی رعوت سے جواب دیا۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے کہ احرار غدار ہیں۔"

ماسٹر جی نے تحمل کا رشتہ نہ چھوڑا لیکن مرزا نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرے دیا۔۔۔۔۔ وہی ڈاڑھا خانی!

شیخ صاحب نے غصہ میں کروٹ لی۔ مرزا سے پوچھا، کیا کہا آپ نے؟

میں نے؟

جی ہاں!

"احرار، پاکستان کے غدار ہیں۔" مرزا نے منشی بھیجتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب کہاں رکتے۔ گورنمنٹ ہاؤس، گورنر موجود، وزیر اعلیٰ موجود، وزیر اعظم موجود، صدر مملکت کی بارگاہ! فوراً جواب دیا۔۔۔۔۔ "احرار، غدار ہیں کہ نہیں۔ اس کا فیصلہ ابھی تاریخ کرے گی۔ تمہارا فیصلہ تاریخ کر چکی ہے کہ تم غدار ابن غدار ہو۔ تمہارے جد امجد میر جعفر نے سراج الدولہ سے غدار کی تھی۔ تم اسلام کے غدار ہو۔" ڈاکٹر خان نے شیخ صاحب کو آغوش میں لے لیا اور سکندر مرزا سے پتو میں کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ شریطانہ لہجہ میں بولنا۔ یہ بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔" ظاہر ہے کہ جی، ایک ہی جھگے میں سپر انداز ہو جاتی ہے۔ یکایک اس کا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔

مجھے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا اور نہ کوئی حاشیہ چڑھانا ہے۔ عیاں راہیہ ہیں! لیکن ایک

الطاف گوہر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ اسکندر مرزا جبر کی سائنس سے نا آشنا تھے۔ لیکن اسے کیا کچھے اور اسے کیا کیسے کہ نواب کالا باغ کے جبر کی سائنس تو، نہ نظر پاتی ہے اور نہ اطلاقی! خود الطاف صاحب کا بیان ہے

نواب صاحب کو حبیب اللہ خان پر کوئی اعتماد نہ تھا اس لئے کہ وہ "پراچل" حکومت کے قریب نہیں آنے دینا چاہتے تھے انہوں نے اپنے دو وزیروں محمود ہارون اور غفار پاشا کو یہ کام سپرد کیا کہ حبیب اللہ خان کو کامیاب نہ ہوئے دیا جائے۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو ایوب خان کو محسوس ہوا کہ نواب صاحب نے ذاتی خاصیت کی وجہ سے لیگ کے سرکاری امیدوار کو ہرودایا ہے۔-----، صدرالایوب بھی دربار میں شمولیت کے لئے بلوچستان گئے تو نواب صاحب بھی دربار میں موجود تھے۔ صدر اور گورنر کی کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی گئی تھیں مگر نواب صاحب نے اپنی کرسی ذرا پیچھے سرکالی، اس پر ایوب خان بے کما "نیں نواب صاحب پیچھے مت بیٹھے" وہ دن بھر ساتھ رہے اور رات کا کھانا بھی اکٹھے کھایا مگر ایوب خان نے ضمنی انتخاب کے بارے میں کوئی بات نہ کی ابھی صبح ناشتے پر نواب صاحب نے خود یہ معاملہ اٹھایا اور کہا کہ لیاری میں سرکاری امیدوار کی جگہ کی وجہ ان کے دو وزیروں کی سازش تھی، اور وہ ان کے خلاف تحقیقات کا حکم دینے والے ہیں، ایوب خان نے کہا "نواب صاحب سربازار گندے کپڑے دھونے سے کیا حاصل، وہ

دو نوں وزیر میری رمتا سے مقرر ہوئے تھے انہیں لود آف اریج کر دیئے گئے تھے یہی رمتا واپس لے لی "بس اس کے ساتھ ہی ایوب خان اور نواب کالا باغ میں برسوں کا تعلق ختم ہو گیا۔"

اب فرمائیے کہ نواب کالا باغ کی نفسیات، اخلاقیات اور جبر کی سائنس میں جو نئے وقار، جھوٹی عزت، جھوٹی دوستی، جھوٹی ولاداری اور جھوٹے مٹھنے کے سوا، اور بھی کچھ رکھا تھا؟ مجھے معلوم ہے کہ الطاف صاحب بھی نواب صاحب کی راست بازی اور راست گفتاری کے مبلغ و مناد نہیں، میں اور اوپر کی روایت میں تو ”مذہبی لاکھ یہ بیماری سے گواہی تیری!“

اصل میں مجھے بھی حیرانی یہ ہوئی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق نواب کالا باغ کے بیان کو الطاف صاحب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ (معذرت کے ساتھ) گویا اس کی Credibility کا اشتہار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہتر کے انداز ہو گا کہ یہ، اصول روایت کے سراسر منافی ہے۔ پھر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کیئرڈے کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ باور کر لینا کہ وہ حریف اور مد مقابل سے یوں آسانی سے ہار مان گئے ہوں گے "اسٹائے سادگی" ہی تو ہے۔ یہ لوگ تو جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس میں ظلم کے مقابلے میں Diplomacy کی بجائے Contumacy کا عنصر پوری طرح (بلکہ بری طرح) غالب و حاوی تھا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ ایسی روایتوں اور حکایتوں کا سامنے آنا کس سطح کے لوگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اس اشتغال سے گریز و احتراز کس حد تک لازم ہے۔؟ خود الطاف گوہر صاحب کو آج بھی بہت سے نوابانِ سبز باغ، مجیب الرحمن کے چھے نکات کا مصنف بتلاتے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو سے گوہر صاحب کو جو تعزیر و تہذیب پر مبنی تعلق رہا ہے، اس کے Second Phase کے متعلق راول عبدالرشید فرماتے ہیں کہ "بھٹو صاحب نے ان کو انٹینیشنل کیا۔ ان کے بجائے (تجمل حسین) کو سفیر بنا کے بھیجا۔ انکوریٹ پلانٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ اصولوں پہ کیا۔" کیا یہ سب کچھ مان لیا جائے؟ اور کیوں نہ مان لیا جائے؟۔۔۔۔۔ امید ہے گوہر صاحب میرا لکھتے سمجھ گئے ہوں گے۔

ہفت روزہ "لاہور" لاہور (مرزائی جریہ)

ان کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے عوامی نفسیات کے ماہر ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔ پنجاب کے عوام کو تو محض طور پر ان کا تقریروں کا ایسا لپکا بلکہ چکا تھا کہ وہ نظریاتی مخالفت کے باوجود رات گئے تک بیٹھ کر آپ کی تقریریں سنتے اور چسکے لیتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل جب احرار کا کانگریس سے سا جھا ہو چکا تھا اور یہ جماعت اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کو نا ممکن بنانے کے لئے ہر ممکن سعی میں مصروف تھی۔ احرار نے حب معمول شاہ صاحب کے حسنِ خطابت کو آلہ کار بنایا اور اس دور کی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ کے لکتنے ہی شیدا والہ ان کی تقریریں اسی ذوق و شوق سے سننے آتے تھے جتنے ذوق و شوق سے وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

نئی زندگی میں شاہ صاحب نہایت ہی سادہ اور پُر خلوص، بذلہ سنج اور منہاسر انسان تھے۔ جماعت احرار نے ہمیشہ آپ کی سادگی کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے اکسپلاٹ کیا اور وہ اپنی ان کمزوریوں یا صفات کے باعث ہمیشہ اکسپلاٹ ہو جاتے رہے۔ شاہ صاحب کے گلے میں ایک عجب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوا کرتا تھا جب اپنی تقریروں سے پہلے تلاوتِ کلام پاک کیا کرتے تھے۔